تامل زبان کے ادیبوں کا دعوا ہے کہ انھوں نے بین الاقوامی معیار کی کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن کا یہ فخر و افتخار ایسا بے دلیل بھی نہیں ہے۔ اِدھر مشرق میں بنگال، اُدھر جنوب میں سارا جنوبی ہند، تامل دیس، ملیالم دیس، کنڑی دیس اور تلنگانہ دیس، لال اور گیروی مٹی سے بنے ان سبزہ زاروں کے افسانوی ادب کا ایک قابلِ ذکر حصہ دنیا کی دوسری زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے، اور یہ سچ تو آپ کی چشمِ نگہ دار سے دور نہیں ہوگا کہ ایک زبان کے ادب کی دوسری زبان میں منتقلی سفارش اور تعلقاتِ عامہ سے نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے تو تادیر قائم نہیں رہتی۔ بڑا ادب عشق اور مشک کے مانند ہوتا ہے۔ سات تہہ خانوں کے پرت بھی خوشبو کا راستہ روک نہیں سکتے۔

ٹی، جے کانتن، جنوبی ہند کے باسی، تامل زبان کے قلم کار ہیں۔ ۵۶-۱۹۵۵ء کے دورانیے میں انھوں نے لکھنا شروع کیا اور رسالوں کے ذریعے متعارف ہوئے۔ اپنی ابتدائی کہانیوں ہی سے انھوں نے ناقدوں اور قارئین کو دم بخود کر دیا۔ جلد ہی اُن کا نام تامل زبان کے فسانہ نگاروں میں مستند و معتبر ہو گیا تھا۔ جے کانتن نے وہ موضوعات فسانہ بنانے کی کوشش کی تھی جن پر لوگ آنکھ اُٹھا کے بات نہیں کر پاتے یا پہلو چرا جاتے ہیں۔ یوں کہیے کہ جے کانتن نے گونگی انگلیوں اور دیدوں کو زبان دی ہے۔ تنکے تو سبھی کی آنکھوں، سبھی کے سینوں میں سوزش بپا کرتے ہیں پر ایک قدم آگے آ کے صدا بلند کرنے کا سزاوار ہر کوئی نہیں ہوتا۔ یہ رندی و سرمستی کی بات ہے جے کانتن نے بڑے نازک معاملات و مقامات کی خامہ کشی اس دردمندی اور ہنرمندی سے کی ہے کہ پڑھنے والا خود کو گنہ گار سمجھنے لگتا ہے۔ ۶۶ء میں تو اُن کی ایک کہانی کُندن (اگنی پروے شم) نے جنوبی ہند میں ہل چل مچا دی تھی۔ اس کہانی کا انجام ہندوستان کے روایت پرستوں کو پسند نہیں آیا۔ ایک صاحب نے تو اسی عنوان سے اس جیسی ایک کہانی لکھ کر انجام بدل دیا۔ جے کانتن صبر و ضبط سے سب کچھ سہتے رہے اور خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔ ۷۲ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا اور نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے ہندوستان کی دیگر زبانوں میں اُن کی کہانیوں کے مجموعے تمام تر اہتمام سے شائع کیے۔

جے کانتن کو جنوبی ہند کے پس منظر میں دیکھیے۔ یہاں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زندگی کی کشاکش زیادہ شدید ہے۔ دیہات سے لوگ روٹی کے سراغ میں شہروں کی طرف اُمڈ رہے ہیں۔ کلکتے اور بمبئی کی طرح مدراس میں بھی بہت نفسا نفسی ہے۔ وہی امیر غریب، تعلیم یافتہ اور جاہلوں کے ازدحام وہی محل اور جھونپڑیاں، کمخواب اور ٹاٹ کے تضاد و تفاوت کا تصادم، شہروں میں جا بجا دیہات بسے ہوئے ہیں۔ نہ شہر پورے شہر بنے ہیں نہ دیہات پورے دیہات رہے ہیں۔ آدمی میں خود کچھ کم دو رنگی و دوعملی نہیں ہے۔ یہ شہر اُسے اور بہکا رہے ہیں، بھٹکا رہے ہیں اور مستزاد یہ کہ آدھے شہر، مردم بے زار، ٹیڑھے بکڑے آدمیوں کے جنگل۔ جے کانتن چرواہوں کی انھی بستیوں کے باسی ہیں۔ کوئی انھیں انقلابی کہتا ہے، کوئی سرکش اور باغی مگر جے کانتن میں موسموں سے مزاحمت اور مفاہمت کی اچھی صلاحیت ہے۔ وہ قطبین کے مابین رہنے والے آدمی ہیں۔ اُن کی آگ اس قدر وحشی نہیں ہے، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح ہے۔

کہانیوں کے علاوہ انھوں نے انشائیے بھی لکھے ہیں، سیاسی مضامین بھی۔ دو تامل فلموں کی ہدایت کاری بھی کی ہے مگر کہانی ہی اُن کا اصل ہنر ٹھہرا ہے۔ اسے ایک شعوری کوشش بھی کہنا چاہیے۔ جے کانتن جو کچھ کہنا اور جتانا چاہتے ہیں۔ اس کی بہ تمام و کمال ترسیل و تاثر کے لیے انھوں نے کہانی کا ذریعہ اختیار کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کہانی کہیں بھی دور نہیں ہوتی، پوری طرح چھائی رہتی ہے۔ اس شمارے میں اُن کی تین کہانیاں آپ کی نذر ہیں۔ انتخاب ذرا مشکل کام تھا، اسے قرعہ سمجھیے۔ قرعے میں یہ تحریریں سامنے آ گئیں۔ ممکن ہے کسی نئے ادیب سے ملنے کی کوئی طمانیت حاصل ہو۔

نئے عہد کے ایک نوجوان کے کہانی اُسے گھڑی دیکھنے نہیں آتے تھے

جنوبی ہند سے، ایک آئینہ کار، داستان طراز ٹی، جے کانتن کی تین منتخب تحریریں

"ایک منٹ ٹھیریے، بلاتا ہوں۔" آپریٹر نے کہا۔ "آپ دینو بول رہا ہوں۔"

کون ہیں؟"

تھوڑی دیر بعد پتاجی کی آواز ٹیلی فون پر

اُس نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ "میں اُن کا بیٹا "ہیلو! میں بول رہا ہوں، سندرم۔"

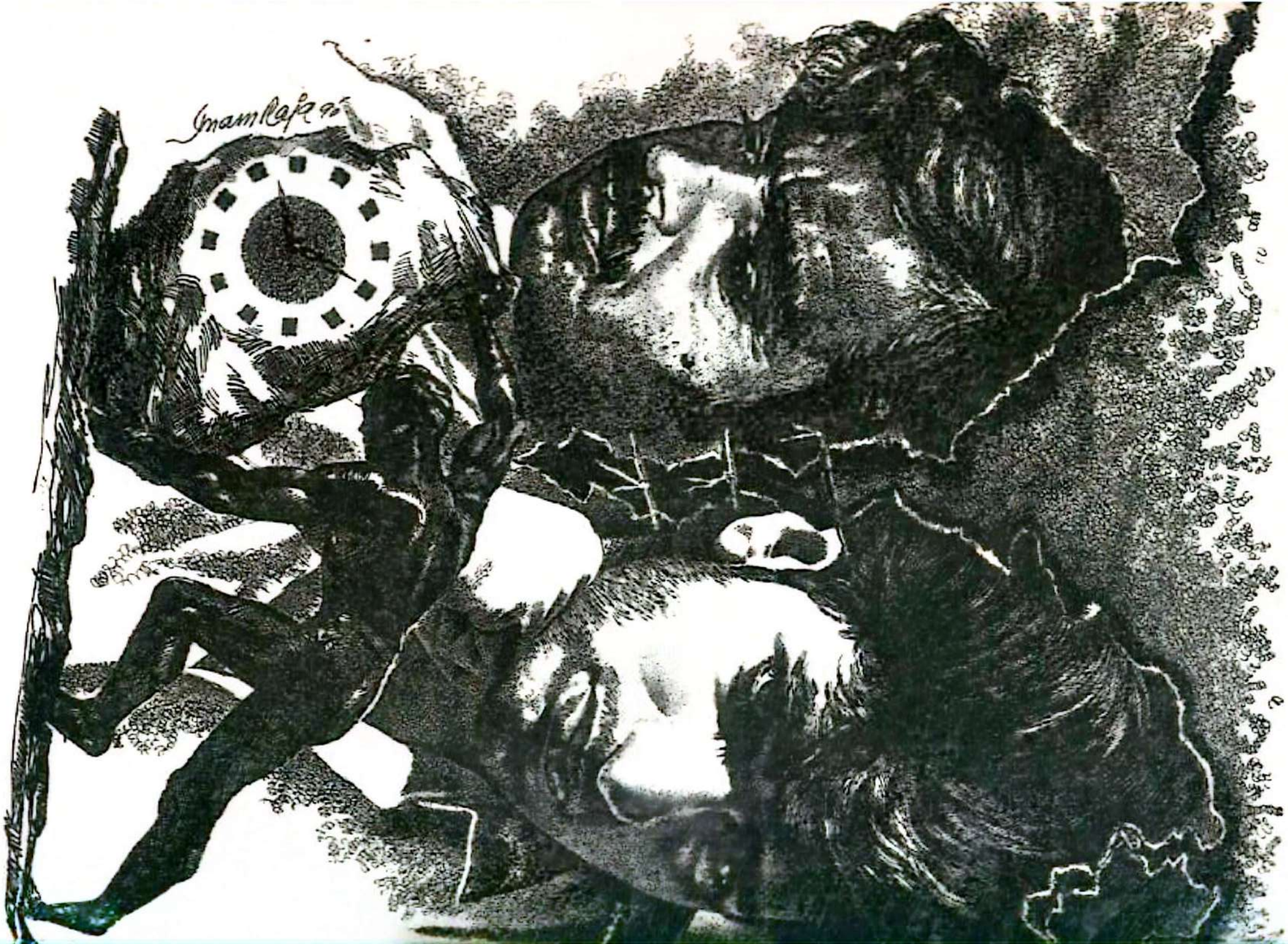
Imam Rafa 96

پتا کی آواز سنتے ہی اُس کا غصہ، ہمت اور نفرت سب کچھ جانے کہاں کافور ہو گیا۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے جیسے تیسے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "میں وینو بول رہا ہوں۔ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں.... ہوں۔ اکیلے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر میں گھر پہنچ رہا ہوں۔"

"نہیں۔ میں گھر میں باتیں کرنا نہیں چاہتا۔ آپ وہیں رُک جائیے۔ میں آجاتا ہوں ابھی دس منٹ میں۔"

"او، آئی سی۔ ٹھیک ہے، آجاؤ۔"

"تھینکس۔"

وینو نے رسی ورر رکھ دیا اور ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اُس کا دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ کتنی ہی باتیں کہنی تھیں اُسے۔ وہ جیسے کسی بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا اِس لیے تلوے پر مکّے مارتا ہوا بڑبڑانے لگا۔ "ہوں، یہ میرا فرض ہے۔ اِس خاندان کا وقار قائم رکھنا میرا فرض ہے۔ پتاجی کو اِس کا احساس دلانا ہے کہ اُن کی عادت بگڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے اپنے بیٹے کو مجبور ہو کر اُنھیں سمجھانا پڑ رہا ہے۔ چھی، کتنی شرم کی بات ہے مگر مجھے بہت صبر سے کام لینا چاہیے۔ اُن سے بحث کرنی ہے اور اُن کے اِس قابلِ نفرت راز کا بھانڈا سب سے پہلے اُنھی کے سامنے پھوڑنا ہے۔ وہ حیلوں بہانوں سے بات ٹالنے کی کوشش کریں گے مگر اُن کی میز کی دراز میں رکھا ہوا وہ خط؟ وہ پریم پتر ساتھ لے جانا ہے۔ پتاجی ضرور بگڑیں گے۔ اچھا تو تم نے نقلی چابی سے چوری چھپے یہ خط تلاش کیا ہے، کیوں؟ اُنھیں بگڑنے دو۔ اُن کے چوری چوری چلنے والے پیار کے چکّر کا ہمیں پتہ لگانا تھا اِسی لیے ہم نے دراز کھولی۔ یہ کوئی بڑی بھول تو نہیں ہے۔ ہم نے جب پرسوں رات اُنھیں اُس لڑکی کے ساتھ سیکنڈ شو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تب کمرے کی تلاشی لی، ساری بات کا پتہ چلانے کے لیے۔

وینو جلدی سے کپڑے پہن کر گھر سے نکلنے لگا۔ اُس کی والدہ رمنی امّا اچانک سامنے آگئیں۔ وہ لیڈیز کلب جا رہی تھیں۔ ماں کا دل بھانپ گیا تھا کہ کچھ دنوں سے وینو کا برتاؤ ٹھیک نہیں ہے۔ اب اُس کے تیور دیکھ کر وہ کچھ مشکوک سی ہو گئیں۔ اُس کے چہرے کی تھکاوٹ سے اُنھیں شک ہونے لگا کہ یہ ڈھنگ سے کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا نہیں۔ لگتا ہے ٹھیک سے سوتا بھی نہیں ہے۔ وہ کم زور اور کالا ہو گیا تھا۔ ہونٹوں کے اُوپر نیچے اور گالوں پر شیو نہ کرنے کی وجہ سے بال بڑھ گئے تھے۔ اُس کی بے حد تھکی ہوئی آنکھوں اور [illegible] کے نیچے اُبھری ہوئی کالی لکیروں سے صاف ظاہر تھا کہ [illegible] وجہ سے انتہائی پریشان ہے۔ یہ اب ہوشیار ہو گیا ہے۔ [illegible] کی اپنی لاکھ باتیں ہوں گی، اُن میں دخل دینا ٹھیک نہیں۔ ماں اپنی زبان پر قابو رکھنے کا فیصلہ کرتی ہوئی وینو کے [illegible] آگئی۔ "کہاں جا رہا ہے بیٹا؟" اُنھوں نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وینو کانپ اُٹھا۔ "تھوڑا کام ہے۔" اُس نے [illegible] سے جواب دیا۔

"واٹ از رانگ وِدھ یُو؟ خیر کچھ بھی ہو [illegible] تمھارے کسی کام آسکتی ہوں تو کہو؟" اُنھوں نے انگریزی [illegible]

"تھینکس۔" وینو اپنے آپ کو آزاد کرا کے جانے [illegible]

مگر ماں نے روک لیا۔ "جا، باورچن نے کوئی خاص چیز بنائی ہے آج۔ کھا کے چلا جانا۔" اُنھوں نے [illegible] کی، پھر گھڑی کی طرف دیکھا اور جلدی سے باہر چلی گئیں۔

وینو کچھ دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ کیسی [illegible] ماں جی۔ پتاجی کا بھی کوئی جواب نہیں۔ کتنی صفائی سے [illegible] دیے جا رہے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا دل اپنی [illegible] کے لیے بھی غم اور نفرت سے بھر گیا۔ اِس عمر میں ماں [illegible] سنگھار، مُنہ پر تھپی ہوئی پاؤڈر کی تہہ، رنگے ہوئے [illegible] شارٹ سلیو والا بلاؤز اور یہ، یہ انگریزی۔ ہونہہ۔

باہر دالان میں کونونٹ میں پڑھنے والے اُس کے چھوٹے بھائی اور چھ سالہ بہن صوفے پر بیٹھے جوتے موزے اُتار رہے تھے۔ اُسے ایسا لگا کہ غیر ذمّے دار [illegible] گم راہ باپ اِن بچّوں کا مستقبل مٹّی میں ملا دیں گے۔ [illegible] اُسے اپنے دادا دادی کی یاد آگئی۔ اچھا ہوا انھیں اِس [illegible] ماحول میں نہیں پلنا پڑا۔

پچیس سال پہلے وینو کے پتا پروفیسر سُندرم [illegible] کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ دونوں کی ذاتیں مختلف [illegible] ماں باپ کی مخالفت کے باوجود سُندرم نے رمنی [illegible]

کی شادی کی تھی۔ رمنی اماں مغربی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ رندم کے رمنی کی طرف کھنچ جانے کا ایک سبب یہ بھی ذات کے لحاظ سے یہ ایک بے جوڑ اور مخلوط شادی تھی اس لیے شادی کے بعد لگ بھگ دو سال رندم کا اپنے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ دو سال بعد دینو پیدا ہوا۔ بیٹے کا پیار کھو دینے کے بعد پوتے کی خبر پاکر دینو کے دادا گن پتیا پلے اور اُن کی بیوی سے نہ رہا گیا۔ دونوں اُسے دیکھنے گاؤں سے شہر آئے۔ اس طرح دینو کے سبب سے اُن کے درمیان ملنے اور تعلق کا پُل آہستہ آہستہ پھر بن گیا۔

دینو چھ سال کا ہوا تو گن پتیا پلے نے کہا کہ وہ اُسے لے جائیں گے۔ ایک غیر اور اجنبی لڑکی جانے کہاں کی تھی، گن پتیا پلے جانے کس دیس کی تہذیب کے پیچھے ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے تھے۔ یہ بات اُن کے دل میں بھی کچوکے لگا رہی تھی۔ غالباً اسی کی تلافی کرنے کے لیے انھوں نے دینو کو گود لے لیا۔ اس طرح دینو اپنے دادا کو پیارا کر بڑا ہوا۔ ماں باپ کا گھر اُس کے لیے کسی دشت دل کی طرح تھا جہاں وہ اپنی چھٹیاں گزارا کرتا تھا۔ اُس کے دادا ویشنو ذات کے تھے۔ شیو بھگت تھے اور تامل بھی بڑے عالم تھے۔ اُن کی بیوی وشالم انیسویں صدی کی آخری نمائندہ تھی۔ وہ خاوند کے سامنے بیٹھتی نہیں تھی۔

چھٹیوں میں جب بھی دینو گھر آتا، اُسے اپنے ماں باپ کے سب طور طریقے سب کچھ مختلف اور پرائے پرائے لگتے۔ اپنے ماں باپ بھی اُسے ہمیشہ نامانوس لگے۔ جب تک وہ تھا، ماں باپ کا یہ تجربہ وہ اپنے دادا دادی کو بیان کرتا اور اُن کا مذاق اُڑاتا مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوا اپنے دادا دادی سے اپنے ماں باپ کا موازنہ کرنے لگا۔ دین دار اور روایت پرست دادا دادی کو وہ میاں بیوی کے روپ میں دیکھتا تھا اور ماں باپ کو بدلتے ہوئے بھی اُس کے دل میں اُن کی جگہ تھی۔

ہائی اسکول کے بعد دینو گاؤں کے سب سے قریبی شہر کے کالج میں داخل ہوگیا۔ اُس کی پڑھائی اگرچہ جدید ڈھنگ سے ہوئی مگر نئے زمانے کی ہوا اُسے چھو تک نہیں گئی تھی۔

اب چند ہی مہینے پہلے وہ پڑھائی ختم کرکے مدراس آیا تھا۔ دادا دادی سے بچھڑنے پر وہ کتنی مشکل سے راضی ہوا تھا۔ "مجھے نوکری نہیں کرنی۔ سب پڑھے لکھے لوگ شہر چلے جاتے ہیں اسی لیے آج اپنے دیش کی یہ حالت ہے۔ میں یہیں رہ کر اپنی زمین، اپنی کھیتی سنبھالوں گا۔" اُس نے دادی کو کتنا منایا تھا۔ ویسے دادی کو بھی اُس کی تجویز بہت پسند تھی۔

مگر دادا نے دیر تک آرام کرسی پر آنکھیں موندے رہنے کے بعد دادی کو سمجھایا۔ "تم بھی کیسی ناسمجھ ہو۔ اس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہی ہو۔ یاد کرو، اپنے بیٹے سے بچھڑ کر تمھیں کیسا لگا تھا؟ اب تک اسے رکھ لیا لیکن اب اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

"میرے جانے نہ جانے سے وہاں کسی کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" دینو نے شکایت بھری آواز میں کہا۔

"دینو!" دادا نے سمجھایا۔ "یقین کرو بیٹا! تم ہمارے ساتھ رہو گے تو تم سے زیادہ خوشی ہمیں ہوگی لیکن اس سلسلے میں کوئی مستقل فیصلہ پھر کرلیں گے۔ فی الحال تم کچھ دنوں کے لیے تو رہ آؤ۔" وہ رُکے۔ "میں یہ سب کچھ کہہ تو رہا ہوں مگر جیسے ہی تم گاڑی میں بیٹھو گے، پتہ نہیں میری اور تمھاری دادی کی کیا حالت ہوگی۔ ہم کیسے دن کاٹیں گے۔ بہ ہر حال جیسے تم چھٹیوں میں ہمیشہ جاتے تھے اسی طرح اب بھی چند دنوں کے لیے ہو آؤ۔ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔"

وہ ماں باپ کے ہاں آگیا۔ پہلے چھٹیوں میں پورے دو مہینے گزرنے پر بھی اُسے ایسی گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی جیسی اب کے کُل دو ہفتوں میں ہونے لگی تھی۔ اُسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ماں جی اور پتا جی کا ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھانا، صبح آٹھ بجے تک ماں جی کا سوتے رہنا اور پتا جی کا دوڑ دوڑ کر اُن کی خدمت کرنا۔ ان باتوں پر اُسے شرم آنے لگی۔

ساٹھ سال کی عمر میں بھی صبح تڑکے اُٹھ کر نہانے والی، ہلدی اور کُم کُم سے سجی ہوئی اُس کی لچھمی جیسی دادی اُسے برابر یاد آتیں۔ وہ کس لگن اور عقیدت سے دادا جی کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ مگر پتا جی؟ یہ آدمی تو جورو کا غلام ہے۔

ماں جی سینما جاتیں، لیڈیز کلب جاتیں مگر پتاجی انھیں کچھ نہ کہتے۔ ماں کو بھی جیسے پتاجی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ نہ کچھ پوچھتیں نہ کچھ کہتیں آہ، افسوس۔ کہیں ایسی بھی ازدواجی زندگی ہوتی ہے؟ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ وینو کے دل میں نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ جانے دو، مجھے ان سے کیا لینا۔ دادا جی کا حکم ہے اِس لیے چند دن یہاں رہ لیتے ہیں پھر ہمیشہ کے لیے گاؤں چلے جائیں گے۔

شروع سے الگ تھلگ رہنے والا وینو اور بھڑک اُٹھا۔ یہ واقعہ پچھلے ہفتے رونما ہوا تھا۔ رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سندرم چھت پر تھے۔ وینو نے رسی در اُٹھایا۔ "ہیلو!"

"میں شیاما بول رہی ہوں۔ آپ سے ملنے کالج گئی تھی مگر آپ چلے گئے تھے۔ آج ساؤنڈ آف میوزک کا آخری دن ہے۔ نائٹ شو میں چلیں؟ آپ چپ کیوں ہیں؟"

وینو کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ پہلے اُسے رانگ نمبر کا شک ہوا مگر کالج میں ملنے کے ذکر سے یہ شک دُور ہوگیا۔ کچھ نہ سوجھا تو اُس نے چپ چاپ رسی در رکھ دیا اور بازو کے کمرے میں بھاگ گیا۔ وہاں اکیلا بیٹھ کے وہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ پتاجی کے سوا کوئی مرد اِس گھر میں نہیں ہے۔ وہ لڑکی، شیاما ہمیشہ ٹیلی فون کرتی ہوگی، اور کیا؟

تھوڑی دیر میں پھر گھنٹی بجی اور بجتی رہی۔ وینو اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ نتیجتہً خود پروفیسر سندرم نے نیچے اُتر کر رسی در اُٹھایا۔ "ہیلو!" وینو آہستہ سے اُٹھا اور چپ چاپ بیچ والے دروازے پر کان رکھ کے اُن کی گفتگو سننے لگا۔ پتاجی انگریزی میں بول رہے تھے۔ "نہیں تو، میں چھت پر تھا۔ ہوں۔ چہ چہ چہ۔"

"اِٹ از رائٹ۔"

"..... ... ..."

"میرا بڑا بیٹا ہوگا۔ ہاں، گاؤں میں تھا۔ ابھی حال میں۔ ہاں۔"

"..... ...."

"اور کوئی بالغ یہاں نہیں ہے۔"

"..... ...."

"ٹھیک ہے۔ دیکھ لوں گا۔ اوکے۔"

"..... ...."

"نائن تھرٹی۔ یس۔ اوکے۔"

"..... ...."

"ڈونٹ وری۔"

"..... ....."

"اوہ..... واٹ آر یو ٹاکنگ.....؟"

"..... ....."

"بائی....."

گفتگو ختم ہوتے ہی وینو دروازے کے پاس سے کھسک گیا۔

اِس واقعے کے بعد سے وینو نے پتاجی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ کسی طرح اُن کی نظروں سے بچتا رہا۔ چار دن پہلے وہ میں بالکل اکیلا تھا اِس لیے پتاجی کے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے ڈپلی کیٹ چابیاں لگا کر اُن کی میز اور الماری پوری تلاشی لی، ایک چور کی طرح کمرے کا چپا چپا چھانتے ہوئے وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔ اُس کے خیال میں سے کہیں زیادہ قابلِ شرم حادثے ہو رہے تھے جن کے مقابلے میں اُس کی یہ چوری نفی کے برابر تھی۔ میں کیوں ڈروں۔ غلط راستے پر چلنے والے آدمی سے نظر چرانے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ انھیں ڈانٹ پھٹکار کر صحیح راستے پر لانا ہے۔ یہ میرا فرض ہے لیکن اگر وہ میری بات نہ مانے تو؟ دیکھا جائے گا۔ پہلے کھل کر باتیں ہو جانی چاہئیں۔ کل ہر حال میں دو ٹوک بات ہو ہی جانی چاہیے۔ اِس میں ڈرنا کیسا؟ میں اب بچہ تو نہیں ہوں۔ آئی ایم این ایک

سمندر کے کنارے حال ہی میں بنائی جانے والی کول تار کی سڑک پر پروفیسر سندرم نے اپنی مارکس مارٹن کر دی۔ پاس بیٹھا ہوا وینو پہلے کار سے اُترا۔ اُس کی نظر دُور تک پھیلے ہوئے سمندر پر گئی۔ اپنی ہوا میں پھر پھر اُڑتی دھوتی اُس نے گھٹنوں تک تہہ کر کے باندھ لی اور کچھ ہٹ کر ریت پر کھڑا ہوگیا۔ دس پندرہ منٹ تک وہ

...ن میں رہا کہ آخر بات شروع کیسے کی جائے؟ غلطی پتاجی
...کی تھی لیکن جھجک اُسے ہو رہی تھی۔ کہیں مَیں طیش میں
...حیثیت بھول کر کچھ کہہ نہ بیٹھوں؟ پھر کیا ہوگا؟

سُندرم کار سے باہر آئے۔ اُنھوں نے اپنا کوٹ اُتارا
...تہ کر کے گاڑی کی سیٹ پر رکھ دیا پھر گاڑی کے شیشے
...چڑھا دیے اور دروازے مقفل کر کے آگئے۔ دینو کے
...آگے وہ رُک گئے اور کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے
...ابھی تو پانچ ہی بجے ہیں۔"

"یہاں تو بالکل بھیڑ نہیں ہے۔" دینو نے کہا۔

شام کا سایہ ابھی سمندر کے ساحل پر نہیں اُترا تھا۔
...اچانک خاموش ہو گئے اور ریت پر کچھ دُور تک
...ہے۔ اُنھیں دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ باپ بیٹے
...وہ دو بھائی معلوم ہو رہے تھے یا پروفیسر اور طالب علم
...دونوں کی شکلیں بہت ملتی تھیں۔ قد ایک سا تھا مگر
...ٹاپے کی تہہ چڑھ چکی تھی اس لیے دینو اُن سے تھوڑا
...ہا تھا۔ وہ سر جھکا کر ریت میں دھنستے ہوئے
...جا رہا تھا۔ ہر پل اُس کے دل کا بوجھ بڑھ رہا تھا سینے
...ہوا غصّہ گلے میں آکر اٹک رہا تھا۔ چہرہ سُرخ ہو رہا
...اور ہونٹ دانتوں میں دبے جا رہے تھے۔ آخر اُس نے آنکھیں
...اُٹھائیں اور دُور سمندر کی لہروں پر نظر گاڑ دی۔ آنکھوں
...دونوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو ہوا میں اُڑ کر اُس کی
...بھگونے لگے۔ پتاجی نے اُس کی طرف پیار سے دیکھا،
...ان کیا اور تکلّفاً مسکرائے۔ دینو کے ہونٹ کپکپا گئے۔
...نے پوچھا۔ "یہاں بیٹھا جائے؟" دینو جواب دیے بغیر
...گیا۔ کیسے شروع کروں؟ دینو سر اُٹھا کر اُن کی طرف
...پھر نظریں جھکا کر ریت میں اُنگلیوں سے لکیریں کھینچنے
...پتاجی جانتے تھے کہ دینو اُن سے کیا بات کرنا چاہتا ہے۔
...ان کال کے بعد دینو سے اُن کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔
...اندازہ تھا کہ دینو فطری جھجک کی وجہ سے اُن کی
...سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُنھیں یہ اچھا نہیں
...تھا کہ دینو خاصا سنجیدہ ہے اور اس موضوع پر
...بحث کرنا چاہتا ہے پھر بھی وہ ایک بزدل آدمی کی
...ملاقات ٹالنا نہیں چاہتے تھے۔

اچانک دینو زیرِ لب بولا جیسے اپنے آپ سے کچھ کہہ
...رہا ہو۔ "آئی ایم ساری! یہ بہت ہی شرم کی بات ہے۔"
اُس نے انگریزی میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ جانتے ہیں مَیں کس
بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں؟" اُنھوں نے ہچکچائے بغیر
ہاں کہہ کر سر ہلا دیا۔ دینو اُن کی دلیری دیکھ کر طیش میں آگیا۔
"مَیں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آپ اس طرح
کے آدمی ہیں۔" اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ دل میں اُمڈتا
ہوا جذبات کا طوفان دبانے کی کوشش میں زور سے
ہنس پڑا۔

سُندرم نے اُس کا کندھا تھپ تھپایا۔ "دینو! ڈونٹ
بی سلی۔ اب تم بچے نہیں ہو۔ سکون سے کچھ سوچا کرو۔"

"یس۔ یس۔ آئی ایم این اڈلٹ۔" اُس نے دانت
کچکچا کے کہا اور جو مُنہ میں آیا، انگریزی میں بولتا چلا گیا۔
شاید پرائی زبان ہی میں اس موضوع پر باپ بیٹے کی گفتگو
ہو سکتی تھی۔ "آپ کو وہ ٹیلی فون والی بات یاد ہے؟ اُسی دن
سے میں غور کر رہا ہوں.... اس سے پہلے میں نے سوچا بھی
نہیں تھا کہ میرا باپ ایسا آدمی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ اپنے
خاندان کی عزّت کا سوال نہیں ہے؟ کیا ایسی حرکت کسی آپ
کی عمر اور حیثیت والے کو زیب دیتی ہے؟ ماں جی بھی کتنی

شگفتہ شگفتہ

نام وَرامریکی بذلہ سنج باب ہوپ سے کسی نے پوچھا۔ "بال
گرنے لگیں تو آدمی کیا کرے؟"

"نیچے سے ہٹ جائے۔" ہوپ نے جواب دیا۔

*

ہالی وُڈ کا ممتاز اداکار رچرڈ برٹن ہوٹلوں میں فراخ دلی سے بخشش
دینے کے لیے مشہور تھا مگر سوئٹزرلینڈ کے قیام میں اُسے ہوٹل کے
عملے سے کچھ شکایات پیدا ہو گئیں۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ یہاں کسی
کو ٹپ نہیں دے گا۔

روانگی کے دن وہ اپنے کمرے سے لے کر باہر کھڑی ہوئی کار
تک سب کو مایوس کرتا ہوا نکلا لیکن کار کا دروازہ کھولنے والے شخص
نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "سر! آپ یقیناً مجھے نہیں بھولیں گے۔"

رچرڈ برٹن نے اُس کا پھیلا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر
گرم جوشی سے ہلایا۔ "ہرگز نہیں بھولوں گا دوست! تمھیں تو میں
امریکہ پہنچتے ہی خط لکھوں گا۔"

بھولی ہیں اور آپ! آپ عمر بھر انھیں بے وقوف بناتے رہے ہیں۔"

سندرم سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لیتے ہوئے اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔ یکایک انھوں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا: "اپنی ماں کو بیچ میں نہ لاؤ۔ تمھیں اپنی طرف سے جو کچھ بھی کہنا ہے، کہو چاہے وہ کتنا ہی نامناسب کیوں نہ ہو۔ میں سب کچھ سنوں گا مگر ماں کو اس معاملے میں مت کھینچو۔ میں اُسے تم سے زیادہ جانتا ہوں اور تم مجھے جتنا سمجھتے ہو، اُس سے کئی گنا زیادہ وہ مجھے سمجھتی ہے۔ پچیس سال ہم نے گرہستی چلائی ہے، آگے بھی چلائیں گے۔ تم آگے کہو۔"

"آپ ماں جی کو دھوکا دے کر ایک جھوٹی زندگی گزار رہے ہیں مگر آپ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔" سندرم ہنس پڑے جیسے انھیں دھوکا دینے کی قطعاً ضرورت نہ ہو۔ وینو بولتا رہا: "آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں صرف ایک ٹیلی فون کی وجہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ دوسری بار ٹیلی فون پر آپ نے جو کچھ کہا، میں وہ بھی سن رہا تھا۔ پھر تقریباً تو بجے آپ کار لے کر بھاگے بھاگے چلے گئے۔ میں نے پیچھا کر کے آپ دونوں کو تھیٹر میں بھی دیکھا تھا مگر صرف اس ایک بات کو لے کر کوئی کسی پر شک نہیں کر سکتا۔ اسی لیے بعد میں آپ کے کمرے میں گھس کے میں نے الماریاں اور درازیں دیکھیں۔ آپ کے وہ محبت نامے۔ اُن کی میں نے فائل بنالی ہے۔ یہ دیکھیے، اُن میں سے ایک خط۔" اُس نے غصے میں جیب سے ایک کاغذ نکال کے اُن کے منہ پر دے مارا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں، گلا بھی رندھ گیا۔

ساحلی سڑک پر نیلی بتیاں جل گئی تھیں۔ کنارے پر لوگوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ اُن کی طرف ایک ہجوم سا آرہا تھا۔ جب تک ہجوم پاس سے گزر نہیں گیا، دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وینو ہی نے بات شروع کی: "آپ میرے پتا ہیں۔ مجھے سچ مچ اس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے ایک بیٹا ہوتے ہوئے یہ باتیں آپ کو سمجھانی پڑ رہی ہیں۔ کم سے کم اب آپ کو اپنی عادتیں سُدھار لینی چاہئیں۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں۔" اس سے زیادہ وینو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

سندرم نے ایک لمبی سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ کیا کہنا چاہیے، کیا نہیں کہنا چاہیے؟ وہ سگار پیتے ہوئے سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے پھر یک بیک ایک پختہ یقین سے انھوں نے وینو کی طرف دیکھا۔ انھیں کو کچھ باتیں سمجھانے کا خیال آیا پھر یہ سوچ کر انھوں نے اپنا خیال بدل دیا کہ زبانی جواب اور چیز ہے، تجربہ اور ہے اور ان سب سے پیدا ہونے والا یقین اور چیز۔ نرم لہجے میں وینو سے مخاطب ہوئے: "ٹھیک ہے کہ اس سلسلے میں تمھیں کون سی بات نقصان پہنچاتی ہے۔"

وینو کو ایک طرف غصہ آرہا تھا، دوسری طرف وہ سوچ رہا تھا کہ اس آدمی کو کیا ہو گیا ہے؟ پھر اسے اپنے باپ پر رحم سا آگیا۔ اُس نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا: "پتاجی! آپ ایک پروفیسر ہیں، ایک باوقار خاندان میں پیدا ہوئے ہیں اور چار بچوں کے باپ ہیں۔ اتنا بوڑھا ہونے کے بعد بھی آپ کی آوارگی کے سبب آپ کو سخت پریشانی ہو رہی ہے کیوں کہ وہ اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملتی دیکھ رہا ہے۔ کیا ان باتوں سے آپ کو کوئی سروکار نہیں؟"

وہ بول رہا تھا اور سندرم غور سے اُس کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کا آدھا چہرہ اندھیرے میں اور آدھا اُجالے میں تھا۔ اُس کی آنکھیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ اُن کی طرف دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ "وینو! تمھارا کہنا ہے کہ تم بالغ ہو گئے ہو۔ یہ درست بھی ہے لیکن ایک بالغ میں یقین کی جو پختگی ہونی چاہیے، وہ تم میں کہاں ہے؟ تو ایک پتا کے ناتے میں اپنی نجی باتوں پر تم سے بحث ضروری نہیں سمجھتا۔ تم کہہ رہے ہو کہ تمھیں خاندان کی حیثیت کی فکر ہے۔ یہ فکر تم سے کئی گنا زیادہ مجھے ہے۔ کوچوٹ پہنچی تو اُس کا مقابلہ کرنے کی ہمت بھی مجھ میں ہے۔ یہ بات میں تمھیں کیسے سمجھاؤں، مجھے سمجھانے کی ضرورت کیا ہے؟" اُن کی رُعب دار آواز میں کسی غلطی یا ندامت کا احساس کا شائبہ تک نہ تھا۔

اُن کی مستقل مزاجی دیکھ کر وینو کو خیال آیا کہ اُسی کی تو نہیں ہے؟ پھر اس نے سوچا کہ دیکھو

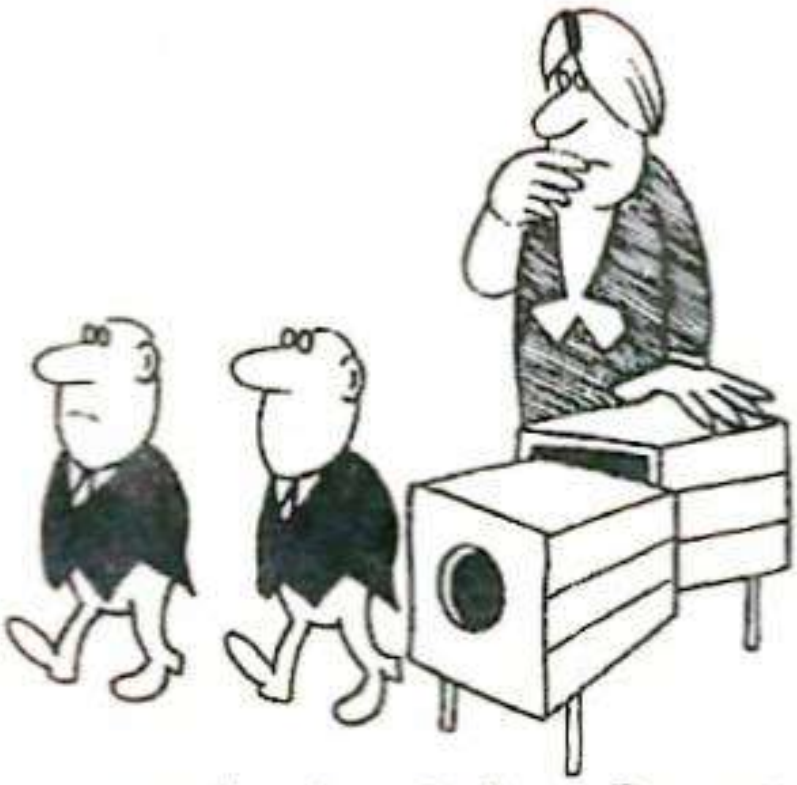

ہیں ایک پرائی عورت سے تعلق رکھتے ہیں مگر کتنے نڈر
ر لفاظی کیے جا رہے ہیں۔ اُسے پھر غصہ آگیا۔ "آپ کہہ
ے ہیں کہ سمجھانے کی ضرورت کیا ہے، بتاؤں کیا ضرورت
ہے؟ میں آپ کی بیوی کا بیٹا ہوں اور آپ انھیں دھوکا
ہے ہیں۔" اُس نے دانت پیستے ہوئے انگریزی میں کہا۔
"اچھا تو کیا اُس نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟" انھوں
نرمی سے پوچھا۔
"نہیں۔"
"پھر تم کیوں ہم میاں بیوی کے معاملے میں دخل دے
ہے ہو؟"
"آئی ایم یور سن۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ یہ میرا
ن ہے۔"
"نہیں بیٹے! یہ تمھارا فرض نہیں ہے۔ میاں بیوی
معاملے میں بیٹے کو دخل دینے کا حق نہیں ہوتا۔"
وینو نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے۔ اُسے رونا آرہا
اور پتاجی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر بھاگ جانے کی
ش ہو رہی تھی۔ اُس کی تڑپ اور تکلیف دیکھ کر سُندرم
ہت افسوس ہو رہا تھا۔ اُس کی توجہ ہٹانے کی طاقت
یں نہیں تھی۔ انھوں نے پیار سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔
اُس نے چھوٹے بچے کی طرح جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا
ور بالکل رُوہانسا ہو گیا، بھرّائی ہوئی آواز میں اُس
نے کہا۔ "پتاجی! ان باتوں پر مجھے بڑی ہتک محسوس
تی ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟"
پروفیسر کو ہنسی آگئی۔ "مائی بوائے! تم ایک سمجھ دار
نوجوان ہو، تمھیں یہ باتیں مجھ سے نہیں پوچھنی چاہییں۔ تمھارے جذبات میں سمجھتا ہوں۔ تمھارے خیال کے مطابق اگر میں کوئی غلط کام کر بھی رہا ہوں تو اُسے صرف دل میں رکھو۔ وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ تم سمجھنے لگو گے کہ کون سی بات درست ہے اور کون سی غلط، اور کون سی بات کہاں تک درست یا کہاں تک غلط۔ تم سے پیار کرنے والے پتا کے رشتے سے میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ ذرا سوچو، پتاجی کے نجی معاملوں کی چوری چھپے چھان بین پر تمھیں ہتک محسوس نہیں ہوئی؟ تمھاری جگہ میں ہوتا تو عمر بھر شرمندہ رہتا۔"

یہ معافی اور شرمندگی کی باتیں وینو کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں مگر وہ اتنا بھانپ گیا تھا کہ پتاجی کو سدھارنا یا انھیں اقبالِ جرم پر راضی کر لینا اُس کے بس سے باہر ہے۔

سب بچوں میں صرف وینو رمنی اما کو ماں جی اور سُندرم کو پتاجی کہتا تھا۔ باقی بچوں کے لیے وہ ممی اور ڈیڈی تھے۔

ماں جی بالائی منزل کے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی جولین ہکسلے کی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ وینو نے کتاب کا سرورق پڑھا۔ "نالج، مورالیٹی اینڈ ڈسٹینی۔" وینو نے پوچھا "ماں جی! میں نے آپ کی پڑھائی میں خلل تو نہیں ڈالا؟"

"ارے، یہ کیا تکلفات، کیا فارملی ٹیز لے بیٹھا تو؟ ادھر بیٹھ۔" انھوں نے پیار سے اُسے پاس بٹھا لیا۔ وینو کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ماں جی بے چینی سے اُس کی طرف دیکھ

رہی تھیں۔ اچانک انھیں اتنے بڑے بیٹے کی ماں ہونے پر فخر محسوس ہوا۔ دینو انگلیوں کے ناخن کترتا ہوا سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ شاید پہلے کبھی وہ ماں جی کے پاس کسی مسئلے پر بحث کرنے یا مشورہ لینے نہیں آیا تھا۔ آج اُس کے آنے پر انھیں خوشی ہو رہی تھی۔ اُس کی جھجک دیکھ کر وہ خود بولیں۔ "دینو! یہاں تم بہت بور ہو رہے ہو نا؟"

"ہوں۔" دینو نے سر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "بور نہیں بلکہ یہاں کی زندگی مجھے پسند نہیں ہے۔ آخر میں ایک دیہاتی ہی تو ہوں۔ آپ لوگ بہت جدید ہیں، بالکل جدید زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس زندگی میں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا ہوں۔" اُس نے پھر سر جھکا لیا اور تلوے پر انگلیوں سے لکیریں کھینچنے لگا۔

چند لمحوں بعد رمتی اماں نے کہا۔ "تمھاری اُلجھن میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میرا خیال ہے ہم جیسے اتنے برسوں سے رہ رہے ہیں، ویسے ہی آج بھی ہیں۔ مجھے تو کہیں کوئی نئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ تم اپنے دل کی بات صاف صاف نہیں کہو گے تو میں کیسے سمجھوں گی۔" وہ سوچنے لگیں کہ اس کے دل میں کس وجہ سے اُتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہاں آ کر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے جیسے میں کسی پرانے گھر میں رہ رہا ہوں۔ یہاں کا رہن سہن، رنگ ڈھنگ، سب کچھ مجھے غیر سا لگتا ہے۔ آپ لوگوں کی محبت، شفقت، سب دکھاوے کی ہے۔ آپ ایک جھوٹی زندگی گزار رہی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ پھر سے دادا جی کے گھر چلا جاؤں۔" وہ رُک رُک کر بول رہا تھا۔

ماں جی چپ چاپ سُن رہی تھیں۔

دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ دوپہر کا وقت تھا، گیارہ بجے تھے اس لیے گھر بھی بالکل خاموش تھا۔ نیچے باورچی خانے میں کھانا پکانے والی بوڑھی عورت بھی سو رہی تھی۔ گھر اور گلی دونوں سنسان تھے۔ ماں نے بیٹے سے سوال کیا۔ "دینو! اچانک یہ تمھارے لیے ایک مسئلہ کیسے بن گیا؟ اتنا تو میں سمجھ سکتی ہوں کہ دادا جی کے گھر اور اس گھر میں کافی فرق ہے لیکن تمھیں اپنی عمر کے اعتبار سے دادا جی کے گھر بوریت ہونی چاہیے۔ مانا کہ آدمی کی پسند اور دل چسپیاں اُس کی عادتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں پھر بھی تمھارا گھر یہی ہے۔ یہاں تم جس ڈھنگ سے رہنا چاہو رہ سکتے ہو۔ تمھیں کون دوسرے کی آزادی میں دخل دینے کی عادت یہاں نہیں ہے۔ نہ معلوم تمھیں کہاں تک یاد ہے۔ جب تم دادا دادی گاؤں لوٹنے لگے تو تم بھی اُن کے ساتھ کے لیے ضد کرنے لگے تھے۔ خود وہ بھی تمھیں اپنے رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی اور تمھاری خوشی کے لیے تمھیں بھیج دیا تھا۔ یہاں بچوں کی آزادی کی ہمیشہ گئی ہے۔ یہاں اپنی مرضی کے مطابق رہنے میں سی رکاوٹ ہے؟ ہوں، بولو؟" انھوں نے اُس دیکھا، وہ چپ چاپ اُن کا منہ تک رہا تھا۔ "ایسا تو ہے کہ تم کسی اور وجہ سے گاؤں لوٹنا چاہتے ہو۔ کیوں؟"

"ہاں، وجہ تو کوئی اور ہے۔" دینو اپنے دل لگانے والی حقیقتوں کے لیے الفاظ ڈھونڈنے کی کرنے لگا۔

"دینو! یہی نہیں۔ تم کچھ اور بھی کہہ رہے ہو زندگی کو دکھاوا اور جھوٹ وغیرہ کہہ رہے ہو۔ یہ کیا اتنی جلدی تم اس فیصلے پر کیسے پہنچ گئے؟ تم کس دکھاوے کی بات کر رہے ہو؟ لگتا ہے تمھارے دل کو کوئی گہرا پہنچی ہے۔ نہیں تو یہ الفاظ تمھارے منہ سے نہ نکلتے۔ کیا بات ہے؟"

دینو نے جیب سے رومال نکال کے ناک اور پونچھا۔ اُس کا منہ لال ہو گیا۔ "ماں جی! مجھے پتا جی کا پسند نہیں ہے۔" اُس نے منہ پھیر کر آسمان کی طرف ہوئے کہا۔ اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ آگے کہنے یہ سوچ کر اتنے دن خاموش رہا کہ آپ دونوں میں جائے گا اور آپ کی زندگی کا سکون میری وجہ سے ہو جائے گا۔" ماں جی سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھ اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "پتا جی.... پتا جی آپ دھوکا دے رہے ہیں۔ اس بات پر میں چپ رہا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں بھی دھوکے بازی میں دے رہا ہوں۔ یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ میں نہیں رہنا چاہتا۔ پتا جی کو میں کیسے سمجھا ہوں۔ ہو سکے تو آپ ہی انھیں صحیح راستے پر بہرحال یہ آپ دونوں کا معاملہ ہے۔ میں جا رہا

نے اُن کی طرف دیکھے بغیر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔ اُسے ایسا لگا کہ وہ رو پڑے گا۔ وہ سمجھ رہا تھا ماں جی اُس سے کرید کرید کر ہر بات پوچھیں گی اور اپنے فریبی خاوند کو غصے میں بُرا بھلا کہیں گی اور یہ راز اپنے بیٹے کو معلوم ہو جانے پر شرمندگی محسوس کریں گی۔ یہ سوچ کر وہ ایک مجرم کی طرح وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر ماں جی کی بالکل شانت لیکن جذبات سے بھرائی ہوئی آواز نے اُسے روک لیا۔ "دینو!" اُن کے چہرے پر کسی تمنا کے نقوش نہیں تھے۔ انھوں نے پیار سے کہا: "بیٹھو۔" دینو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں سمجھی تھی، تم اپنا کوئی مسئلہ لے کر آئے ہو مگر یہ بات تو تمھارے پتا جی کے بارے میں ہے اچھا مذاق ہے۔" انھیں ہنسی آگئی۔

"تو کیا آپ پہلے سے اس کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟"

"میں نے اس بارے میں کبھی کچھ جاننا ضروری نہیں سمجھا۔" وہ سنجیدہ ہو گئیں۔ "وہ تمھارے پتا اور میرے پتی ہیں۔ یہ بات جتنی سچ ہے، اتنی ہی یہ بھی سچ ہے کہ وہ ایک پروفیسر، ایک جیّد عالم اور ایک باحیثیت آدمی ہیں۔ ہے نا؟" اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولتی رہیں۔ "حیرت ہے کہ تم اپنے پتا کی جن باتوں پر فخر کر سکتے ہو، انھیں چھوڑ کر وہ باتیں لے بیٹھے جن سے تمھیں ٹھیک ٹھیک واقفیت بھی نہیں ہے۔ جو بات ایک پوشیدہ راز ہو، اُسے کرید کر معلوم یا شرمندہ ہونا کیا تمھیں اچھا لگتا ہے؟"

دینو اُبل پڑا۔ "میں پوری واقفیت حاصل کر کے بات کر رہا ہوں ماں جی! آئی ہیو پروفس۔ میرے پاس ثبوت ہیں۔ میں ثابت کر سکتا ہوں۔ اُن کے پاس آیا ہوا ٹیلی فون اور اُن کی باتیں میں نے اپنے کانوں سے سنی ہیں اور تھیٹر جا کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں اُن کے محبت نامے بھی دیکھ چکا ہوں اور اُن کے کمرے میں محبت ناموں کی ایک فائل رکھی ہے۔ یہ سب کچھ میں انھیں بتا بھی چکا ہوں۔ وہ انکار نہیں کر سکے۔"

"اوہ! اِٹ اِز اے شیم آن یو۔ بڑے ثبوت لایا ہے۔ مشہور لوگوں کی بدنامی کا دھندا کرنے والے سنسنی خیز رسالے ہوتے ہیں نا، اُن کے پاس بھی ہوتے ہوں گے ثبوت۔ کیا شریف لوگ ایسے رسالے زرد صحافت کہہ کے اس لیے دُور ہٹاتے ہیں کہ اُن کے پاس ثبوت نہیں ہیں۔ وہ آدمی کمال اور اُس کا رتبہ چھوڑ کر اُس کی نازک اور خفیہ کمزوری کا سرِعام چرچا کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اس سے تہذیب کا صرف نقصان ہوتا ہے، فائدہ نہیں۔ اسی لیے ایسے رسالوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اب تم نے جو کچھ کہا اُس میں اور زرد رسالوں میں کیا فرق ہے؟ تم اُنھی کی طرح کہہ رہے ہو کہ تمھارے پاس ثبوت ہے۔ تم پر بہت افسوس ہو رہا ہے۔ شیم! اِٹ اِز اے شیم آن یو۔" رمنی اما نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے سچ مچ یہ کیا ہے؟ دینو! سوچو، اتنے آدمی کے ساتھ تم نے کتنا بُرا برتاؤ کیا ہے۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

اُن کے تیور دیکھ کر انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے دینو نے کہا۔ "ماں جی! میں نے آپ کی اور خاندان کی بھلائی کے لیے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔"

"دینو! مجھے بہت بُرا لگ رہا ہے۔ اُن کے بارے میں سوچ کر نہیں بلکہ تمھارے بارے میں سوچ کر۔ تمھیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک باپ کے ساتھ بیٹے کا ایسا میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ آپ کو دھوکا دے رہے ہیں....."

"اِٹ اِز مائی پرابلم۔" انھوں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہ میرا معاملہ ہے۔ تمھیں میری نجی زندگی میں ٹانگ اڑانے کا کیا حق ہے؟" وہ رنج سے کانپ اٹھیں۔ "میں نے پچیس برس بہت پُرسکون گزارے ہیں اور آخر گزاریں گے۔ میں یہ سکون اور یہ خوشی برباد کرنے والی بات میں دخل اندازی نہیں کرتی۔ مجھے بھی اُڑتی اُڑتی ملی تھی۔ تو کیا ہوا؟ میرے ساتھ سے بڑھ کر پیار انھیں کہیں نہیں ملے گا۔ جیسا تم کہتے ہو، مجھے اس کا دُکھ ضرور ہے۔" وہ چشمہ اُتار کر بہتے ہوئے آنسو پونچھتی کرسی سے اُٹھ گئیں اور برآمدے میں کچھ دور جا کر کھڑی ہو گئیں۔ پھر سنبھل کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ "دینو! تم سمجھتے ہو، زندگی اتنی سیدھی، اتنی سپاٹ نہیں۔ بہت ہی پیچیدہ اور اُلجھن پیدا کرنے والی چیز ہے۔

ان پیچیدگی کے درمیان رہ کر گرہستی پُرسکون رکھنا اور خوشی سے چلانا ہی زندگی کا فن ہے۔ اگر میں نے ایسی حرکتیں کی ہوتیں تو میں اس گھر کا سکون اور خوشی میں ملانے کا سبب بن جاتی۔ کسی بھی وجہ سے انھیں تلخی میں رکھنے کے لیے میرا خود غرض بن جانا اس گھر کا اور میرے بچوں کے مستقبل کے لیے کتنی بُری بات ہوتا۔ یہ سب سن کر تم یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی پوشیدہ دل میں چھپا کر جی رہی ہوں۔ ہاں، ایک چھوٹی سی کسک دل میں ہے۔ دنیا میں مکمل خوشی حاصل کر لینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے بولنے کا حق ہے یا نہیں، یہاں اس کا سوال نہیں ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ بولنے سے آخر فائدہ کیا ہے؟ کسی کی بیرونی سرگرمی سے مجھے بھلا کتنا نقصان ہو سکتا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میرا چپ رہنا ایک دانش مندی ہے۔ دینو! بتاؤ کسی کی عزت کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کسی کی ظاہری کسی کی پرائی ویسی اور کسی کے باطن میں زبردستی بھی اُسے جاننے کی کوشش نہ کرنا، عزت کرنا کہلاتا ہے۔ کسی سے پیار کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اُس شخص کی کوئی کمزوری جانتے ہوئے بھی اُس کی عظمت سمجھنا۔ اُس کی خوبیاں تباہ کرنے کے بجائے اُس کی خامیوں سے لڑنے کا نام ہی تو پیار ہے۔ تمھیں معلوم ہے آدمی کا من کتنا پاک چیز ہوتی ہے۔ اٹ از سم تھنگ سیکریڈ اور سدا رہے دینو! اس میں کسی دوسرے کا داخلہ گنوار پن ہوتا ہے چاہے وہ دوسرا کوئی بھی ہو۔"

"ماں جی! آپ اُن کی بیوی ہیں؟"

"تو کیا ہوا؟ یہ اختیار غلط استعمال کرنے سے میرا چھن بھی تو سکتا ہے۔"

"کیسے چھن سکتا ہے۔ کیا اس معاملے میں پتا جی آپ کے ساتھ اور طرح پیش آئیں گے؟"

"پیش آئیں گے کیا، آتے رہے ہیں۔ اپنی اوقات بھول کر کے لیے خاوند پر یا خاوند کے لیے بیوی پر شک کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنا حق سمجھ لے۔ میاں بیوی، بیٹے، ماں، باپ رشتوں کے دھاگے میں بندھے ہوتے ہیں مگر کیا الگ الگ انفرادیت، الگ الگ اکائیاں نہیں ہیں؟ ہر آدمی کا اپنا ایک باطن ہوتا ہے، اُس باطن کی ہمیں قدر کرنی چاہیے۔ تم نے اپنے پتا جی کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ تم مجھ سے جو کچھ کہہ رہے ہو، یہ سب اُن سے کہنے کی ہمت تم نے کیسے کی؟ میں تو سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی۔ اوہ دینو! یہ تم نے کیا کیا؟" انھوں نے کچھ توقف کیا۔ "خیر، جانے دو۔ تمھارے پتا جی بہت مضبوط اعصاب کے آدمی ہیں، وہ یہ بات جھیل لیں گے اور اپنی کم زوریاں پھلانگ آئیں گے۔ زندگی بے حد پیچیدہ ہوتی ہے۔ اسے ٹھیک سے سمجھ لینا چاہیے۔ لو، یہ کتاب پڑھو۔ اس طرح کے خیالات تمھیں وسیع النظری عطا کریں گے۔"

دینو سخت اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ اُس کی دانست میں صرف اُس کے دادا دادی مثالی میاں بیوی تھے۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آ رہی تھی کہ اُس کے دادا دادی نے بھی صرف دادا دادی بن کر اپنی زندگی نہیں گزاری ہوگی۔

چند دنوں بعد ایک شام کالج سے لوٹ کر سُندرم کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ دو دن پہلے وہ کچھ کہے بغیر گھر سے چلے گئے تھے۔ گاؤں سے دینو کی چٹھی آئی تھی۔ رمنی نے وہ نکال کر سُندرم کے ہاتھ میں دے دی۔ چٹھی کی آخری سطریں یہ تھیں: "میں دادا کا پوتا بن کر ہی رہنے کے لائق ہوں اس لیے چلا آیا۔ آپ لوگوں کی زندگی کم زور اور پیچیدہ دھاگوں سے بنی ہوئی ہے۔ سمجھنے میں میں نے کوئی غلطی کی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ سُندرم ہنسے: "دقیانوسی لوگ ستر سال کی عمر والوں ہی میں نہیں ہوتے، بیس سال والوں میں بھی ہو سکتے ہیں۔"

رمنی اماں کچھ دیر تک بے چینی سے انھیں تکتی رہیں۔ اُن کی آنکھیں لال ہو کر بھر آئیں۔ پھر اپنا گہرا دکھ ہنسی میں بدلتے ہوئے انھوں نے پوچھا: "کیا اب بھی..... آپ..... آپ..... آپ.....؟" اُن کے کپکپاتے ہونٹ سُندرم کے گالوں میں دھنس گئے۔ سُندرم نے انھیں بانہوں میں بھر لیا۔